احمد ندیم قاسمی کے افسانے: تانیثیتی تناظر میں

ڈاکٹر عقیلہ بشیر*

Abstract:

Ahmad Nadeem Qasmi contributed some unforgettable short stories to Urdu literature. There appear some situations reflecting relations of man and woman and we meet some of important female characters in his stories too. Our recent criticism while studying these characters in feminist context does not give importance to localized situation. This article tries to study Qasmi female characters in local context.

لفظ تانیثیت انگریزی اصطلاح Feminism سے ماخوذ ہے اور Feminism لاطینی زبان کے لفظ Femina سے اخذ ہے جس کا مطلب ہے عورت۔ انیسویں صدی میں آکسفورڈ ڈکشنری میں یہ لفظ دیکھنے کو ملتا ہے اگر آج کی عورت سے پوچھا جائے تو اس لفظ کو آپ کن معنوں میں لیتی ہیں تو شاید سب کی رائے تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ فہمیدہ ریاض کے ان جملوں کی تصدیق کریں:۔

> ''میں نے جب بھی اسے استعمال کیا ہے یا کہا ہے کہ میں فیمینسٹ ہوں تو ہر بار میرے ذہن میں اس کا یہی مطلب رہا ہے کہ عورت کے مکمل انسانی وجود کو تسلیم کیا جائے اور اس کے کسی بھی پہلو کو کچل کر نابود کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔''(۱)

اٹھارویں صدی سے آج اکیسویں صدی تک Feminism یا Womenism کے تحت عورت کے جو مسائل سامنے آتے ہیں ان میں معاشی استحصال، جنسی جبر، دہشت، غیر مساوی حقوق، سماجی ناہمواری، قانونی عدم تحفظ، متضاد اخلاقی اقدار، فرسودہ خاندانی ازدواجی رشتوں سے لے کر کاروبار اور سیاسی اقتدار غرض ہر جگہ اُسے

* صدر شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

دوسرے درجے کی مخلوق سمجھ کر رد کرنے کا رجحان ہے جس کے خلاف آواز بلند کرنے کا رویہ تانیثیتی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے ہاں اگرچہ عورت کو پدرانہ معاشرے سے پیدا شدہ استبدادیت کی مختلف شکلوں سے نجات دلا کر اُسے معاشی، سیاسی اور سماجی حقوق دلانا نہیں اور نہ ہی شاید کبھی اُن کا یہ مقصد رہا مگر وہ اپنے افسانوں میں اس طرح کے کردار متعارف کراتے ہیں جو بہت آسانی سے ظلم اور جبر کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتے بلکہ کبھی کبھی حالات کو اپنے کنٹرول میں کرتے دکھائی دیتے ہیں یوں لگتا ہے کہ جیسے ان کے کرداروں کی یہ سوچ ابتدائی محرک کا کام دیتی ہے جن پر آگے چل کر کسی بڑی تحریک یا جدوجہد کا معرضِ وجود میں آنا قرینِ قیاس ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے سوشلسٹ فیمینیزم کے تحت نہ لکھتے ہوئے بھی افسانوی ادب میں جو نظریہ سمویا ہے اس کے تحت ان کے خیال میں سرمایہ دارانہ نظام جو کہ عورت مرد کے درمیان معاشی ناانصافی، انحصاریت، سیاسی گھٹن اور یہاں تک کہ غیر صحت مندانہ سماجی رشتوں کو فروغ دیتی ہے۔ اس خیال کے تحت جب فرد کی پہچان اس کی طبقاتی شناخت سے ہوتی ہے تو پہلے ہی جو دوسرے نمبر کے فرد کے طور پر سماج میں زندگی بسر کر رہا ہے اس کا درجہ آپ کیا تعین کریں گے۔ قاسمی صاحب کے افسانوی مجموعے برگِ حنا کا افسانہ 'وحشی' اس کی ایک خوبصورت مثال ہے جب اُس کے اس جملے پر کہ ''شرم نہیں آتی تجھے ایک کسان عورت پر ترس کھاتے ہوئے، میں پیدل چلی جاؤں گی، مجھے پیدل چلنا آتا ہے۔''

اور بس میں سے کسی کی آواز آئی ''عجیب وحشی عورت ہے' چڑیل، ڈائن، جادوگرنی، ناگن کے بعد یہ ایک اور لقب ہے جو سماج اُسے دیتا ہے کیونکہ وہ چاہتی ہے کہ اُسے ترس کھا کر نہیں ایک فرد سمجھ کر حصہ دیا جائے۔۔۔

حواس سے ہٹ کر بھی عورت کی ایک مخصوص حس ہوتی ہے جو اُسے متنبہ کرتی ہے کہ کہاں کہاں اس کا استحصال ہو رہا ہے یہ نسوایت کا وہ جوہر ہے جو ذہنی تصرف سے عبارت ہے اسے خواتین کی sensibility بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیا عورت کی اس حسیت کو ہم نے کبھی پوری انسانیت کا حصہ بنایا۔ سمجھا تو یہی گیا کہ عورت انسان کی تخلیق کر سکتی ہے مگر وہ لفظ تخلیق نہیں کر سکتی وہ جو بچوں کو بولنا سکھاتی ہے سماج اُسے گونگا دیکھنا چاہتا ہے۔

پتھر کے عہد کا جاہل انسان عورت کے لیے آج بھی اس لیے قابل قبول ہے کہ وہ تخلیق کو عورت کا معجزہ سمجھتا تھا۔ وہ عورت سے مرعوب تھا یہاں تک کہ دیوی بنا کر اُسے پوجا بھی گیا۔ عورت کو جادوگرنی بھی سمجھا جاتا رہا بلکہ بطور جادوگرنی اُسے زیادہ تعظیم دی گئی۔ لیکن جب جسمانی کمزوری کی بدولت اُسے مرد پر انحصار کرنا پڑا تو مرد نے اُس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے مختلف طریقے اپنائے کبھی اُسے مقید کیا گیا اور کبھی اُسے غیر افادی ہونے کی

وجہ سے مار ڈالا گیا۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ معاشرے میں عورت کا مقام ہمیشہ سے مرد کا تفویض کردہ ہے اس نے چاہا تو اسے دیوی بنا دیا چاہا تو باندی بنا دیا۔

انسانی تاریخ عورت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی وہ ماں، بہن، بیٹی، محبوبہ، طوائف، کنیز غرض مختلف صورتوں میں سماج کی رگوں میں خون کی طرح جاری و ساری رہی اس کے وجود کو ہر کسی نے محسوس کیا اور اپنے اپنے ذہن اور سوچ کے مطابق ڈھال کر اس کے ڈھانچے کو رنگین پیرہن دیا مگر اس کی اپنی سوچ کی عکاسی نہ کی گئی اور نہ اس کا حقیقی رنگ ہی سامنے آ سکا۔ عورت کی حیثیت کے حوالے سے عورت کی مظلومیت کو بے نقاب کرنا اور قارئین کو اس کی طرف متوجہ کرنا Feminism سے عبارت ہے۔ Feminism میں عورت کے مسائل، عورت کے حقوق اور عورت کے جائز مقام پر بحث کی جاتی ہے جبکہ Feminine میں عورت کی نسوانی شناخت اور مخصوص عادات و اطوار، سوچ اور کردار پر بحث کی جاتی ہے یوں احمد ندیم قاسمی کے ہاں Feminine رویہ پایا جاتا ہے۔

فاطمہ حسن نے لکھا تھا کہ

> ''صدیوں سے ہماری مذہبی اور دیومالائی کتابوں نے عورتوں کے لیے ایک ہی کردار متعین کیا ہے جس میں وہ مرد سے کمتر ہے کیوں کہ وہ جسمانی طور پر کمزور ہے۔ جذباتی طور پر زیادہ حساس ہے اور معاشرتی دباؤ کو قبول نہیں کر سکتی۔ یہ مفروضہ کہ عورت بزدل ہے، ناقص العقل ہے، مردانہ سماج کی دین ہے۔ انہوں نے اپنی مرضی خیالات اور آسانیوں کے مطابق ایک عورت کا وجود فرض کر لیا ہے اور اسی عورت کو زندگی میں بھی اور تحریر میں بھی برت رہے ہیں۔ مرد انسان ہے۔ عورت کچھ اور ہے کیا ہے؟ کوئی شے؟ شے سے بڑھ کر دیوی، فرشتہ، شیطان یا کوئی اور چیز۔ اس کا فیصلہ مشکل ہے کیوں کہ اس نے تو اس مکمل انسان کو دیکھا ہی نہیں جو فکر، شعور، ادراک اور احساسات میں اس کی ہم پلہ ہے۔'' **(۲)**

صدیوں سے رائج رسوم و رواج کے پردے میں عورت کو معاشرتی زندگی سے اس طرح الگ کر دیا گیا کہ مکمل عورت اپنی ذہانت اور توانائیوں کے ساتھ سامنے آ ہی نہ سکے۔ محکوم بیوی، فرماں بردار بیٹی، عزت کے لفظ کی تجسیم بہن یہ کردار ہر افسانہ نگار نے اپنی بساط کے مطابق تخیل اور اساطیر کا سہارا لے کر تخلیق کیے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے ہاں یہ کردار اگرچہ بیدی اور انتظار حسین سے ہٹ کر اساطیر کے اسیر نہیں مگر ان کے تخیل کی وہ توانا روایت کے امین ہیں جو ان کی زمین اور سماج کی دین ہے۔ ماں، بہن، بیٹی کے وہ تصورات جو سماج نے متعین کیے وہ قاسمی صاحب کے افسانوں میں جوں کے توں برتے گئے ہیں۔ ان کے ہاں بھی افسانوں میں عورت کو ماں کے روپ میں

تعظیم دے کر ایک طرف بٹھا دیا جاتا ہے اگر کسی گھر میں بھائی موجود ہے تو وہ اپنی بہن کے ساتھ غیرت کے جذبات وابستہ کر کے اپنے آپ کو اس کا رکھولا بنا لیتا ہے اور اگر باپ ہے تو بیٹی کے ارمانوں کا سودا کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور بطور شوہر تو وہ مجازی خدا اور سرتاج ہے ہی۔ اگر کسی کے ذہن میں لارنس تھیلیپیا آ رہا ہے تو وہ خال خال مثال ہے وہاں بھی عورت مجبور ہو کر اپنا بدلہ بے زبان پرندے سے لیتی ہے۔

عورت کے مختلف نسائی پہلو فکشن کا موضوع بنتے آئے ہیں کبھی حقیقت سے بعید اور کبھی کبھار حقیقت سے قریب، تخلیقاروں نے عورت کو اپنی ہی آنکھ سے دیکھا اور پیش کیا لیکن افسوس تب ہوتا ہے جب ادب میں بھی کردار تجارتی مقاصد کے لیے پیش کیے جائیں لیکن ایسے بھی لکھاری ہیں جنھوں نے عورت کو محسوس کر کے لکھا عورت کی نمائندگی اس کے اپنے احساسات کی روشنی میں کی ان میں بلاشبہ ایک نام احمد ندیم قاسمی کا بھی ہے۔ ان کے موضوعات دیہات سے متعلق اور کردار متوسط اور نچلے متوسط طبقے سے لیے گئے ہیں۔ عورت مرد کی زندگی کا حصہ ہے اور مرد عورت کی کل کائنات۔ یہ حقیقت قاسمی صاحب کے افسانوں کا بنیادی جزو بنتی ہے۔

عورت مرد کو اپنا بنانے کے لیے سوجتن کرتی ہے کبھی کبھی سوتیلی ماں کی صورت میں اس کا بھیانک روپ بھی سامنے آتا ہے۔ کشمکشِ حیات اپنی بنیادی سچائی کے ساتھ قاسمی صاحب کے افسانوں میں جلوہ گر ہے۔ اس حوالے سے ''صلیبیں مرے دریچے میں'' فیض نے عورتوں کی ذہنی کیفیت کو ایک قیدی کے مماثل قرار دیا ہے۔ بقول ان کے:۔

> ''جیل خانے کی زندگی میں بہت سی چھوٹی چھوٹی خودغرضیاں وافر اور نمایاں ہو جاتی ہیں۔ قید سے پہلے پردہ نشین خواتین کی ذہنیت کا کبھی ایسا صحیح شعور پیدا نہیں ہوا تھا جیسا کہ اب ہے یہ ذہنیت ہر قیدی کی عام ذہنیت ہے۔ اب معلوم ہوا کہ کم ظرفی، گھٹیا پن، چھوٹی چھوٹی الجھنوں سے اتنی لگن کہ وہ عالمگیر مسائل دکھائی دینے لگیں اور واقعی اہم اور غیر ذاتی مسائل سے قطعی بے تعلق، کینہ پروری، بدمزاجی، کبھی خودسری کبھی خاک بوسی، کبھی ہاتھ پاؤں ہلانے سے قطعی گریز اور کبھی بے وجہ کی بھاگ دوڑ مقید اور محکوم زندگی کے عام ذہنی اور عملی لوازمات ہیں جو آسانی سے آزاد لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔''(۳)

نسائی خصوصیات بھی اس قید کے زیرِ اثر تشکیل پاتی ہیں۔ عورت کے درحقیقت وہ احتجاجات ہی ہیں جیسے سماج اس کی کمینگی، چھوٹا پن، مکر، فریب، منہ پھٹ اور نجانے کیا کیا کہتا ہے۔ ایسے میں کرشن چندر جیسی سوچ رکھنے والے کا دم غنیمت لگتا ہے جب وہ قاسمی صاحب کے افسانے السلام علیکم کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

''السلام علیکم میں جب امیر خان جنگ عظیم کے بعد فرانس میں اپنی محبوبہ لیوسی کو الوداع کہہ کر ہندوستان میں اپنے گاؤں واپس آتا ہے تو اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کی لیوسی بنا دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے لیکن انسانی فطرت کی کمینگی سے قطع نظر اس میں حیران ہونے کی کون سی بات ہے قدرت کے قوانین مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں ہیں۔ وہ سماج کے قوانین سے زیادہ کڑے اور مضبوط اور ہمہ گیر ہیں۔ وہ ہندی عورتوں پر بھی اسی طرح حاوی ہیں جس طرح فرانسیسی عورتوں پر، یہ الگ بات ہے کہ ہم اس ملک کی عورتوں کو دوسرے ملک کی عورتوں سے زیادہ پاکباز اور باعصمت سمجھیں۔ مگر مرد پر تو بین الاقوامی اصول ایک ایسے ہیں۔''(۴)

احمد ندیم قاسمی کی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں پر رنگین پردہ نہیں ڈالتے لیکن تہذیب، شائستگی اور اعتدال موجود ہے۔ ان کے موضوعات معاشی ناہمواریوں کے نتیجے میں پنپنے والے مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ انہوں نے خالصتاً عشقیہ یا جنسی افسانہ نہیں لکھا۔ طبقاتی نظام میں مسخ ہونے والی شخصیات اور انسانی فطرت کے اسرار بھی کھولتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال ان کا افسانہ ''گنڈاسا'' اور ''الحمد اللہ'' ہے۔

احمد ندیم قاسمی کا تخلیقی عرصہ کافی طویل ہے اس لیے ان کے ہاں عورت اپنے عہد کے تناظر میں دیکھنے کا رویہ ملتا ہے مثلاً رومانوی، ترقی پسندانہ، فسادات کے زیر اثر، نفسیاتی اور بیک وقت شہری اور دیہاتی تہذیبوں کی نمائندگی کرتی ہوئی عورت مختلف کرداروں کی عکاس۔

بیسویں صدی کے شروع میں رومانوی تحریک کا آغاز سرسید کی نمکینی کے ردِعمل میں ہوا۔ عورت کو پُرتعیش شے کے طور پر متعارف کرایا گیا۔ نیاز، یلدرم، مجنوں، حجاب وغیرہ نے عورت کو ناگزیر سمجھا ضرور مگر جمالیاتی حس کی تسکین کے لیے۔ اس کے بعد انگارے میں لکھنے والے آئے جنہوں نے عورت کے لیے بھی کچھ اشیاء اور جذبوں کو انسانی سطح پر تفویض کرنے کی سفارش کی اور ذہنی آزادی مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کے لیے بھی ضروری قرار دی۔ ڈاکٹر رشید جہاں، احمد علی، منٹو، عصمت کرشن چندر، بیدی، شوکت صدیقی، مفتی، غلام عباس وغیرہ نے عورت کے احساسات کو زبان دی۔ ترقی پسند تحریک نے عورت کو رومان سے نکال کر حقیقت کے روبرو کیا۔ عورت دیوی، پھول، ناگن یا ہرنی نہیں بلکہ ایک فرد تھی۔ جو تقسیم ہند میں ایک مرتبہ پھر بے آسرا اور بے توقیر ہو جاتی ہے۔ اس کی زبوں حالی پھر افسانوں کا موضوع بنتی ہے۔ افسانہ نگاروں کے پاس اس کی مظلومیت کا کوئی حل نہیں لہٰذا وہ اسے اندھے کنویں میں کودتے ہوئے دیکھتے اور دکھاتے ہیں اور جو بچ جاتی ہیں وہ قاسمی صاحب کے افسانے 'چڑیل' میں چڑیل کا روپ دھار کر انسانی آبادی سے دور چلی جاتی ہیں۔ اس کے مقدر میں اب گھر نہیں۔

ایک گھر کی بنیاد مرد اور عورت کے رشتے پر رکھی جاتی ہے۔ اس رشتے میں جہاں وہ محبت اور خلوص دکھاتے ہیں وہاں اس رشتے کو مادی وسائل کے نہ ہونے پر کھوکھلا ہوتے بھی دکھاتے ہیں جہاں محبت کی آزمائش ایک سو روپے کے عوض کی جاتی ہے اور اس آزمائش میں شوہر ہار جاتا ہے جب رئیس خانہ میں فضلو اپنی بیوی سے کہتا ہے ''مجھے میری غریبی دھوکہ دے گئی مریاں'' اور مریاں اس شرط پر اس کے ساتھ رہنے پر رضامند ہو جاتی ہے جب وہ کہتی ہے۔

''تم مرو گے تو نہیں، سسکیوں میں پوچھے گئے اس محبت بھرے سوال پر فضلو کا جواب نہیں، میں ہی ہونا چاہیے تھا۔

''آتش گل'' پڑھ کر یہ آگاہی ہوتی ہے کہ ہمارے سماج میں بیواؤں کے چہروں پر کیوں سرسوں پھولتی ہے۔ زرد رو گلابو، کا کردار بتاتا ہے کہ جب عورت کے پاس نہ شوہر باقی رہے اور نہ روپیہ اور وہ جوان ہو اس کے تین بچے ہوں اور غلہ مہنگا ہو تو بڑی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ ایسے میں پہننے کو کپڑا تو ملتا ہی نہیں۔

قاسمی زندگی کے نہاں خانوں میں جھانک کر کئی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہیں مگر عورت کی باطنی زندگی میں نقب نہیں لگاتے۔ ایک فاصلے پر کھڑے ہو کر اس کے ظاہری سراپے کی اس طرح تصویر کشی کرتے ہیں کہ قاری تحریر پڑھنے سے زیادہ دیکھنے لگتا ہے۔ مثلاً گنڈاسا میں راجو کا سراپا اس طرح کھینچتے ہیں:۔

> ''اور مولا نے دیکھا کہ راجو کی کنپٹیوں پر سنہرے روئیں ہیں اور اس کی پلکیں یوں کمانوں کی طرح مڑی ہوئی ہیں جیسے اٹھیں گی تو اس کی بھنوؤں کو مَس کر لیں گی اور ان پلکوں پر گرد کے ذرے ہیں اور اس کی ناک پر پسینے کے ننھے ننھے سوئی کی نوک کے سے قطرے چمک رہے ہیں اور نتھنوں میں کچھ ایسی کیفیت ہے جیسے گھی کی بجائے پھول سونگھ رہی ہو اس کے اوپر کے ہونٹ کی نازک محراب پر بھی پسینہ ہے اور ٹھوڑی اور نچلے ہونٹ کے درمیان ایک تل ہے۔ کانوں میں چاندی کے بندے، انگور کے خوشوں کی طرح لَس لَس کرتے ہوئے لرز رہے ہیں اور ان بندوں میں اس کے بالوں کی ایک لٹ بے طرح الجھی ہوئی ہے۔''(۵)

اسی طرح ان کے افسانے 'طلائی مہر' میں 'سونی' کا سراپا مکمل اور بھرپور ہے لیکن ہر جگہ عورت کو دیکھنے کا رویہ سامنے آتا ہے برتنے کا نہیں۔ اگر وہ کسی جذبے کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں تو وہ 'مامتا' ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے ''سناٹا'' میں افسانہ 'مامتا' اس جذبے کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ ماں جو اپنے بچے کی بیماریاں تک یاد رکھتی ہے:۔

''نہ جاؤ میرے بیٹے! مجھے بھوکوں زندہ رہنا آتا ہے میں سوچتی ہوں وہاں تمہارے کپڑے کون دھوئے گا تمہارے بالوں میں تیل کون ڈالے گا۔ تمہاری آنکھ میں سے گری ہوئی پلک کون نکالے گا۔ تمہارے چولے کے بٹن کون ٹانکے گا اور پھر پچھلے سال کی طرح تمہارے دشمنوں کو نمونیہ ہو گیا تو اور پچھلے سے پچھلے سال کی طرح میری زبان کوئلہ ہو جائے اگر تمہارے دشمنوں کے آدھے سر میں درد اٹھا تو تمہاری کنپٹیوں میں روغن بادام کون ملے گا۔''(۶)

سوچنے کی بات ہے ایک ماں نے اپنے لیے کیا مانگا؟

ماں کا ہی روپ 'پاؤں کا کانٹا' میں یوں سامنے آتا ہے:۔

''رہ رہ کر اُسے اپنی ماں یاد آ رہی تھی جو اُسے ہاتھوں سے اٹھائے رکھتی تھی جس نے اپنی پڑوسن کو جو ایک دن کریم کے پاؤں سے کانٹا نکال رہی تھی کہا تھا ''اری ذرا دھیرے دھیرے سوئی پھیر بس یہ سمجھ لے، تو میرے کلیجے پر سوئی پھیر رہی ہے۔''(۷)

یہ جذبے بتاتے ہیں قاسمی ایک فاصلے پر کھڑے ہو کر عورت کے سراپے پر ہی نظر نہیں ڈالتے، بلکہ کبھی کبھی دانتوں تلے انگلی دبا کر اس کے کسی عمل پر سوچ بچار کر کے اپنے تئیں نتائج نکالتے ہیں جو ہمیشہ درست نہیں بھی ہوتے۔ لیکن ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ ایک افسانہ نگار ہیں محقق نہیں۔ کیا عورت کو ظلم برداشت کرتے رہنا چاہیے اور قربانی دیتے رہنا چاہیے۔ افسانوی ادب کا ہمیشہ موضوع رہا ہے مگر شہرزاد سے لے کر لحاف تک کی کہانی میں ارتقائی عمل ناگزیر تھا۔ شہرزاد عورت پر ظلم وستم کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے کہانی کا سہارا لیتی ہے جب کہ عصمت کی عورت خود سے ناانصافی کا بدلہ لینے کے لیے لحاف کا سہارا لیتی ہے۔ سماج میں وفا کے معیارات عورت کے ہاں بھی تبدیل ہوئے ہیں یہ تبدیلی بہت سے افسانہ نگاروں کے ہاں کھل کر سامنے آتی ہے۔ قاسمی کے افسانوں 'آتشِ گل' کی گلا بو یا برگِ حنا میں شامل افسانہ جن وانس بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔

مجموعی طور پر آج کی عورت مسائل سے جوجھتی ہوئی عورت ہے گھر میں شوہر اور آفس میں باس کا غصہ برداشت کرتی ہوئی عورت۔ بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے نوکری سے آکر گھر کا چولہا جلانے والی عورت، بوڑھی ساس کے لیے نرس کے فرائض ادا کرنے والی عورت گھر کی صفائی کرنے والی ملازمہ کے روپ میں غرض اپنے لیے تو سوچنے کا وقت ہی نہیں۔ اب وہ اپنے لیے آواز نہیں اٹھائے گی۔ کوئی احمد ندیم قاسمی جیسا افسانہ نگار اسے منصورہ کا درجہ دے کر بیٹی بنا لے تو اور بات ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فہمیدہ ریاض، ’’فیمینزم اور ہم‘‘، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۱۵۶

۲۔ فاطمہ حسن ’’بیدی کی کہانیوں میں عورت: پُرش اور پراکرتی‘‘، مشمولہ، ’’اُردو ادب اور تانیثیت‘‘ مرتبہ: ڈاکٹر قاضی عابد، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۲۱۹

۳۔ فیض احمد فیض، ’’صلیبیں مرے دریچے میں‘‘، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۵۲ء، ص ۲۷

۴۔ کرشن چندر، ’’دیباچہ بگولے‘‘، اساطیر، لاہور، ۱۹۹۵، ص ۱۳

۵۔ احمد ندیم قاسمی، ’گنڈاسا‘ مشمولہ ’’سناٹا‘‘، اساطیر، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۷۷

۶۔ احمد ندیم قاسمی، ’مامتا‘ مشمولہ ’’سناٹا‘‘، ص ۱۰۰

۷۔ احمد ندیم قاسمی، ’پاؤں کا کانٹا‘ مشمولہ ’’بگولے‘‘، ص ۱۳۵